مقالات

اساس دین کی تعمیر

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

جس طرح کسی مکان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ایک بنیاد ہو جس پر اس کی دیواریں اٹھائی جائیں، اور پھر ان دیواروں پر اس کی چھت تعمیر کی جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بنیاد اتنی گہری اور مضبوط ہو جو دیواروں کا اور چھت کا بار اچھی طرح سنبھال سکے۔ ورنہ وہ مکان ہوا کے ایک تیز جھونکے یا بارش کے کسی تند حملے کی بھی تاب نہ لا سکے گا اور اس کو، خواہ اس کی دیواریں اور چھتیں اپنی جگہ کتنی ہی ٹھوس اور پائیدار کیوں نہ ہوں، ایک کھنڈر کی شکل میں تبدیل ہو جانے سے کوئی شے بچا نہ سکے گی۔ پس ایک دانا اور انجام شناس انجنیر کبھی اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا کہ جس جسامت اور وزن کی دیواریں اور چھتیں بنانی ہوں اسی کے تناسب سے بنیاد میں گہرائی اور پائیداری کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اگر ایک پھوس کا چھپر بنانا ہے تو کچی اینٹوں کی فٹ دو فٹ گہری بنیاد بلکہ لکڑی کے معمولی کھمبے، جو بالشت دو بالشت زمین میں گڑے ہوں، اس کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی اوسط درجے کے مکان کی تعمیر پیش نظر ہو تو اس کے لیے کم از کم دو تین فٹ گہری اور تقریباً اتنی ہی چوڑی بنیاد اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ لیکن اگر ایک وسیع اور عالی شان محل تعمیر کرنا ہو جس کی دیواروں اور چھتوں میں لکڑی، بانس، کچی اینٹ اور پھوس، کھپڑے یا سلیٹ کے بجائے پختہ اینٹیں، سمنٹ اور لوہے کی سلاخیں اور گرڈر چنے جانے والے ہوں تو لامحالہ اس کی بنیادیں بھی کئی فٹ گہری اور چوڑی بنانی پڑیں گی، اور ان میں مٹی یا کچی اینٹیں نہیں بلکہ وہی پختہ اینٹیں اور سمنٹ اور آہنی سلاخیں دینی ہوں گی۔ ایک پاگل ہی یہ تصور کر سکتا ہے یا عملاً ایسی حرکت کر سکتا ہے کہ جا تو رہا ہے اہرام مصری کو شرما دینے والی عمارت بنانے اور اس کے لیے بنیاد کھودی ہو دو انگلیوں اور انچوں سے ناپ کر۔

اب ذرا اسی اصول کو لیے ہوئے محسوسات کی دنیا سے نکل کر معانی اور معقولات کے عالم میں آئیے۔

اس عالم میں اس اصول کی اہمیت اور ناگزیری عالم محسوسات کے مقابلہ میں اتنی ہی زیادہ سزاوار ترجیح ہے جتنی خود عقل و معنی حس کے، اور روح جسم کے مقابلہ میں۔ یہ اس لیے کہ اگر وہاں اس اصول کو فراموش کر دینے کا نتیجہ اینٹ اور چونے کی ایک عمارت کی تباہی اور چاندی کے چند سکوں کی بربادی کی شکل میں نکلتا ہے تو یہاں بسا اوقات ساری زندگی کی جاں فشانیوں اور قربانیوں ہی پر پانی پھر جاتا ہے۔ اور یہ اتنی بڑی اندوہناک ٹریجڈی ہے جس سے بچنے کے لیے کوئی ہوش مند انسان اپنی کسی ممکن سعی سے دریغ نہیں کر سکتا۔ وہ کسی اہم انقلابی مقصد کے حصول اور کسی زبردست اصلاحی اسکیم کے قیام و نفاذ کے سلسلہ میں سب کچھ بھول سکتا اور ہر شے سے اغماض برت سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا ذہن اس کی بنیاد کی صحیح تاسیس سے غافل ہو جائے۔ وہ اپنی تمام تر مساعی کا اولین ہدف اسی ایک چیز کو بنانے پر مجبور ہے کہ جس مقصد اور نصب العین کو لے کر وہ اٹھا ہے اس کے لیے اس کی وسعت اور عظمت کے مناسب اساس فراہم کرے، یعنی اس کی اساس میں اتنی گہرائی اور پختگی پیدا کر لینے کا اہتمام کرے جو آگے چل کر اس راہ کی مشکلوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ پوری طرح سہار سکے۔

دین حق کی اقامت، جس کے از روئے قرآن تمام اہل ایمان مکلف ہیں، ایک ایسا نصب العین ہے جس کی مشکلات کی بے پایانی اور جس کی ذمہ داریوں کی گرانباری اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ دوست اور دشمن، موافق اور مخالف، مومن اور منکر، یگانے اور غیر سب اس امر واقعی کا یکساں اعتراف کرتے ہیں۔ غیر اس کا اعتراف اس نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنے والوں کو علانیہ فریب خوردہ بلکہ مجنون کہہ کر کرتے ہیں اور جو یگانے ہیں وہ اس کا اعلان اس کی کامیابی کو "ناممکن" بتا کر فرماتے ہیں۔ لیکن الفاظ کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی، پہلا گروہ مخالف ہونے کے سبب اپنے اس نظریے کو بالکل عریاں لفظوں میں ظاہر کر دیتا ہے اور دوسرا "پاس شریعت" رکھنے کے باعث یا اپنے ادعائے ایمان کی لاج رکھنے کی خاطر اپنے اندر اس بے حجاب جسارت کی تاب نہیں رکھتا اس لیے سیاسی صیقل گری سے کام لیتے ہوئے اپنے اس خیال کو ایک گونہ شائستگی اور خوشنمائی کا رنگ دے کر بیان

کرتا ہے۔ بہرحال جہاں تک اس کام کی دشواریوں اور صبر آزمائیوں کا تعلق ہے، سارے اہل جہان یک زبان ہو کر پکارتے ہیں کہ اس وادی جنوں میں قدم رکھنا ہر مرد کا کام نہیں۔ حد یہ ہے کہ اس نظریہ کی صداقت سے نہ تو اس کو انکار ہے جس نے یہ عظیم الشان ذمہ داری اپنے بندوں پر ڈالی ہے اور نہ ہی ان کو جنھیں اس کارِ عظیم کی سربراہ کاری سپرد کر کے اس دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ (صلوات اللہ علیہم اجمعین) بلکہ یہ سب اسے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ اس کو تسلیم کرتے اور اس کا اعلان فرماتے ہیں جتنی صفائی کہ اوروں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ خود اللہ تعالیٰ ہی کے الفاظ ہیں:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ہم نے یہ "امانت" آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے
وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	پیش کی تھی لیکن انھوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کر دیا اور
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا	اس سے ڈر گئے۔ پر انسان نے اس کی ذمہ داری اٹھا لی یقیناً
(احزاب - ۹)	وہ بڑا ظالم اور نادان ہے۔

معلوم ہے کہ یہ "امانت" کونسی تھی جس کا بوجھ اٹھانے کے لیے زمین و آسمان اور پہاڑ جیسی قوی ہیکل مخلوقات بھی تیار نہ ہو سکیں اور اس کے تصور ہی سے وہ لرزہ براندام ہو گئیں؟ وہ امانت یہی اللہ تعالیٰ کے قوانین تشریعی کی امانت تھی جن کی خود بھی اطاعت کرنی تھی اور دوسروں سے بھی کرانی تھی، یعنی دین الٰہی کی اقامت۔ پھر ان الفاظ کو بھی سامنے رکھ لیجیے جو اس امانت کے آخری ذکر اور دین حق کے آخری علمبردار (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس منصب پر سرفراز کرتے وقت فرمائے گئے تھے:۔

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (مزمل-۱)	ہم تم پر ایک بھاری کلام (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

یہ "قولِ ثقیل" کس شے کو کہا گیا ہے؟ واقعات شاہد ہیں، بعد میں نازل ہونے والے احکام بتاتے ہیں اور خود آیت کا سیاق و سباق پکارتا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی وہی کتاب تھی جس کے نزول کا آغاز ہو چکا تھا اور جس میں بتدریج، بنی نوع انسان کے لیے آخری اور مکمل ضابطہ حیات (دین) ہونے کے باعث ایک ایک شعبہ زندگی سے متعلق قطعی ہدایات آنے والی تھیں، اس لیے لازماً نبی پر نت نئی ذمہ داریوں کا بار گراں پڑنے والا تھا۔

دین حق کی اقامت کے نصب العین کو ایک مشکل ترین فرض قرار دیے جانے پر یہ خدا کی اپنی گواہی ہے، اور زبان قال سے ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ رہ گئے انبیائے کرام، تو یہ وہ لوگ ہیں جو اس فرض اور اس نصب العین کے اولین اور براہ راست ذمہ دار ہیں، اس لیے اس کی صبر آزما تلخ کامیوں کا جتنا شدید اور صحیح احساس ان کو ہو سکتا ہے، اوروں کے ذہن کی پرواز بھی وہاں تک ممکن نہیں۔ مگر چونکہ یہ پاکان خاص اور مردان حق تسلیم و رضا کے پیکر ہوتے ہیں اس لیے ان کی زبان قال کے لیے تو ممکن نہیں کہ اس سے کسی حرف شکایت کا صدور ہو، مگر زبان حال کی بندش ہرگز ان کی دسترس سے باہر تھی چنانچہ اس زبان نے بارہا درد و کرب سے بھری ہوئی چیخیں بلند کیں تاکہ خدا کا ہاتھ آئے اور ان کی بوجھوں سے دبی ہوئی پشت ناتواں کو سہارا دے حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا۔ یہی خاموش چیخیں ہیں جو آیات ذیل کے پس پشت خود خاتم النبیین صلعم کی زبان حال سے بھی سنائی دے رہی ہیں:-

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (الم نشرح)

کیا ہم نے (اے پیغمبر) تمھارے سینے کو (فکر و تردد کے ہجوم سے) نجات نہیں دلائی؟ ہم نے تم پر سے وہ بوجھ اتار کر الگ کر دیا جو تمھاری کمر توڑے دے رہا تھا۔

قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی آیات کا ایک بڑا حصہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی خاطر کے لیے نازل ہوتا رہا ہے۔ آیات ہی نہیں، پوری پوری سورتیں اسی مقصد کو لے کر اتریں۔ جب بھی ایسا ہوا — اور ایسا ہونا کسی صبح بھی غیر متوقع نہ تھا — کہ حالات کی ناسازگاریاں قلب مبارک کو توڑنے لگتیں تو فوراً رحمت الٰہی حرکت میں آتی اور الفاظ قرآن کے لباس میں نمودار ہو کر ٹوٹتے ہوئے دل کو سنبھالتی، ڈھارس بندھاتی اور ایک نئے جوش اور ایک تازہ عزیمت کی توانائیوں سے اسے معمور کر دیتی تاکہ اسی استقلال کے ساتھ تبلیغ و اقامت حق کا کام جاری رہے جو اس کے لیے مطلوب تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک انسان جو اگرچہ افضل البشر اور سرتاج انبیا ہی کیوں نہ تھا، ان ہولناک کشاکشوں اور ناسازگاریوں کے طوفان میں قدم جمائے کھڑا رہ سکتا تھا جو نبوت کے پورے تیئیس سالہ دور میں اس کے اردگرد چھائی رہیں۔ خود قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا ہرگز ممکن نہ تھا:-

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (بنی اسرائیل - ۸۰)

اے محمد! اگر ہم تم کو (جادۂ حق پر) جمائے نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کافروں کی طرف کچھ نہ کچھ ضرور جھک پڑتے۔

چنانچہ قرآن کی تنزیل میں جو اتنی لمبی مدت صرف کی گئی اس کی سب سے بڑی مصلحت بھی یہی تھی کہ منصب رسالت کی ذمہ داریوں میں ایک تدریج کے ساتھ وسعت پیدا کی جائے تاکہ قلب نبوی ان کا بحسن خوبی تحمل کر سکے۔ اگرچہ کفار اشرار نے اس طریقۂ تنزیل کو اپنی دانست میں ایک زبردست اعتراض کا منبع بنایا تھا اور بڑی اونچی آوازوں میں لوگوں کو یہ نفسیاتی مغالطہ دیتے رہے کہ اب تک جتنی آسمانی کتابیں اتری ہیں ان میں سے ہر ایک بیک دفعہ نازل کر دی گئی تھی مگر یہ ایک نئے قسم کی آسمانی کتاب ہے اور غالباً ایک نئے خدا کی جانب سے نازل فرمائی جارہی ہے کہ مہینے پر مہینے اور سال پر سال گذرتے جارہے ہیں مگر کتاب ہے کہ اس کا نزول ختم ہونے ہی کو نہیں آتا! حقیقت یہ ہے کہ یہ مدعی نبوت اپنے چند سازشی حواریوں کی مدد سے شبانہ روز کاوشیں اور دماغ سوزیاں کر کے اپنا یہ قرآن "گھڑتا" ہے اور جب کچھ جملے گھڑ پاتا ہے تو اسے وحی الٰہی کے نام سے لوگوں کو سنانے لگتا ہے، وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ...... وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً۔ لیکن حکمت الٰہی نے ان کے ان نفسیاتی مغالطوں کی طرف مطلق توجہ کی، ہاں ان کے لیے، جو کان اور آنکھیں رکھتے تھے، وہ لفظ فرما کر اپنی حکیمانہ مصلحت پر سے پردہ اٹھا دیا:-

كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ (الفرقان - ۳)

ہاں ہم ایسا ہی کر رہے ہیں تاکہ (اے پیغمبر) تمہارے قلب میں قوت اور جماؤ پیدا کرتے رہیں۔

بس ساری تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ دین حق کی کامل اطاعت اور اس کی تبلیغ و اقامت ہی دنیا کا وہ دشوار ترین فرض ہے جس کی غیر محدود مشکلات کی یکتائی پر پوری کائنات یک زبان ہو کر شہادت دے چکی ہے اور اس شہادت کی سچائی پر اس کائنات کا علیم و خبیر خالق بھی مہر تصدیق ثبت کر چکا ہے۔ ہر چند کہ تپتی اور چمکتی ہوئی دوپہر میں سورج کی طرف انگلی اٹھا کر بتانے اور اس کی شکل و ہیئت پر کسی تبصرہ کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں مگر انسانی نفوس کا عجیب حال ہے جس بات کو ہم نظری حیثیت سے شک و ریب سے بالاتر سمجھتے ہیں، بسا اوقات عمل کی دنیا میں اس کے اولین مقتضیات تک کو

فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ ہم دیکھنے کے باوجود بہت سی باتوں کو نہیں دیکھتے اور جاننے کے باوجود جتائے جانے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس سے ضرورت تھی کہ جو چیز اب تک محض بحث و نظر کی حد تک ہمارے نزدیک مسلّم تھی، اس کو عمل و اقدام کے نقطۂ نگاہ سے دیکھ لیا جائے، اور ایک شخص، جو اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت و رضاجوئی کا عہد کر لینے کے باعث چار و ناچار اقامت دین کا فرض بجا لانے پر مامور ہے، پہلے دن سے اس فرض کی حوصلہ آزما گھاٹیوں کا نقشہ اپنی چشم تصور کے سامنے رکھ لے اور اس طرح رکھے کہ کبھی بھی ان کو سامنے سے اوجھل نہ ہونے دے، ورنہ یقین جانیے کہ ان گھاٹیوں کو پار کرنے کے لیے جو سفر وہ شروع کرے گا اس کے لیے ضروری زادِ راہ کبھی ساتھ نہ لے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی سعی و جہد کے قدم کبھی منزل مقصود سے آشنا نہ ہوں گے۔

اب جب کہ یہ راہ اتنی دشوار گذار اور یہ نصب العین اتنا عزیمت طلب ہے جس کی تفصیل اوپر آپ نے ملاحظہ فرمائی تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس نصب العین کی بنیاد بھی اس انتہائی حد تک عمیق، وسیع اور سنگین رکھی جائے جو اس کے شایانِ شان ہو اور جو اس بھاری بھرکم آہنی عمارت کی دیواروں اور چھتوں کا پورا بوجھ اٹھا سکے۔ ورنہ اگر جلدبازی یا غفلت سے کام لیتے ہوئے اس بنیاد کو کمزور رہنے دیا گیا اور الٹے سیدھے کچھ سنگریزے یا اینٹ کے ٹکڑے رکھ کر آگے تعمیر شروع کر دی گئی تو اس سلسلہ میں کسی مکمل اور مستحکم عمارت بن جانے کی توقع کرنا نتیجۃً اس توقع سے ذرا بھی مختلف نہیں جو ایک پیاسا دور سے چمکتی ہوئی ریت کو دیکھ کر قائم کر لیتا ہے، الا یہ کہ کسی وقت ہمارے لیے قانون فطرت ہی بدل جائے۔

سنگ ہائے اساس تعمیر اساس کی اہمیت معلوم کر لینے کے بعد ہمیں اب اصل مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ وہ کون کون سے پتھر ہیں جو اس بنیاد میں نصب کیے جانے چاہئیں اور جن کے بغیر یہ عمارت اپنی مطلوبہ حد کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں خصوصیت کے ساتھ ان آیات و احادیث اور اسلامی تاریخ کے ان اوراق پر نظر ڈالنی چاہیے جن کا تعلق آغاز اسلام یا بالفاظ دیگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ہے، کہ دین حق یا آسمانی بادشاہت کا وہ حسین اور پرجلال ایوان جس کی پیشانی پر مشیت الٰہی نے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کا طغرائے امتیاز دورِ رسالت کے بالکل آخری لمحوں میں تحریر کیا، اُس کی بنیاد انہی ایام میں ڈالی اور بھری گئی۔ اس بنیاد کے اندر جس کی تعمیر مکمل کرنے میں تیرہ برس کی طویل مدت

صرف ہوگئی، محض چند گنے چنے پتھر ہمیں نصب کیے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں، جن کی دو نوعیتیں ہیں، ایک تو وہ جن کا تعلق انسان کے شعور اور اعتقاد سے ہے، دوسرے وہ جن کا تعلق انسان کے عمل سے ہے پہلی قسم ایمان باللہ اور ایمان بر آخرت پر مشتمل ہے، اور دوسری قسم میں ذکر الٰہی اور صبر شامل ہیں۔ یہی چار چیزیں ہیں جن کی روح کو دلوں کے اندر اتار دینے اور جن کے لوازم و مطالبات کے مطابق لوگوں کو اپنی زندگی ڈھالنے کے لیے آمادہ کر دینے میں دور رسالت کا نصف سے زائد حصہ صرف ہوگیا۔ اس حقیقت کی تفصیلی شہادت تو مکی سورتوں کے صفحات پر دور تک پھیلی نظر آسکتی ہے، لیکن قرآن میں بعض مقامات ایسے بھی آپ کو ملیں گے جہاں یہ حقیقت چند لفظوں میں سمیٹ کر ایسے واضح اور نمایاں طریقہ پر بیان کر دی گئی ہے جس میں کوئی خفا یا ابہام یا اشتباہ نگاہ جستجو کے سامنے حائل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس وقت اسلام کی دعوت انتہائی ناسازگار اور پرہول منزل سے گذر رہی تھی اور اس کے علمبردار سخت ہولناک حالات سے دوچار تھے، اس وقت مسلمانوں کو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو ہدایت کی گئی اس کے الفاظ یہ تھے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہاں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کہہ کر صبر اور نماز کی تلقین کی گئی ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ پیروی حق کے لیے دو قسم کی چیزیں لازم ہیں، ایک تو یہ کہ اعتقادی طور پر الَّذِينَ آمَنُوا یعنی اللہ اور یوم آخرت پر یقین کامل رکھنے والوں میں شرکت ہو، دوسری یہ کہ عملی طور پر صبر اور نماز کی پناہ پکڑی جائے۔ یہ حقیقت آپ کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سورہ طٰہٰ کی ان آیتوں میں نظر آئے گی جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی ہوئی اولین ہدایات اور احکام الٰہی کا (غالباً ایک مجمل) خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے:-

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ
فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى
وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ
لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي

سو جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی اے موسیٰ! (یہ آگ نہیں ہے بلکہ) میں ہوں تیرا رب! پس تم اپنی جوتیاں اتار دو کیونکہ تم اس وقت پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو۔ اور (دیکھو) میں نے تم کو (بار رسالت سنبھالنے کے لیے) چن لیا ہے

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى. فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى	سو اس وقت تم پر جو کچھ وحی کی جا رہی ہے اس کو غور سے سنو میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اس لیے میری بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو، یقین رکھو کہ قیامت

آکر رہے گی جس کو (ابھی مخلوق کی نگاہوں سے) میں چھپائے رکھوں گا (اور یہ اس لیے) تاکہ ہر جان کو اپنے کیے کا بدلہ مل جائے۔ تو دیکھو وہ لوگ تمھیں اس (یوم الحساب کی فکر) سے باز رکھنے پائیں جو اس کے آنے کا یقین نہیں رکھتے اور اپنی خواہشات نفس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، ورنہ تم اس طرح تباہ ہو جاؤ گے۔

ان آیات پر ابتدائی اساسات دین کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور آگے فرعون کے پاس جا کر اس کی تبلیغ کا حکم مل جاتا ہے۔ دیکھو ان میں بھی انہی چار باتوں کی تلقین کی گئی ہے، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، سب سے پہلے توحید (یعنی ایمان باللہ) کا درس دیا گیا ہے، پھر ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد قیامت کے آنے اور اعمال انسانی کا بدلہ دیے جانے کا یقین لانے کو کہا گیا، اور آخر میں فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا کہہ کر اس امر کی تاکید کر دی گئی کہ اس راہ حق پرستی سے تمھیں باز رکھنے کے لیے کفر کا اقتدار خواہ کتنا ہی ایڑی چوٹی کا زور لگائے، تمھیں صبر و استقلال کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ ان ارشادات الٰہی کے اولین اور براہ راست مخاطب خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، رہے بعد میں ان کے ہونے والے پیرو، تو ظاہر ہے کہ اپنے ہادی کی تبعیت میں وہ بھی اسی کے مخاطب ہوں گے۔ جس کا مطلب واضح طور پر یہ ہوا کہ فرائض نبوت انجام دینے کے لیے بھی اور انبیاء کے سچے اتباع کے لیے بھی یعنی دین حق کی اطاعت و اقامت کے لیے بنیادی طور پر جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ یہی چار چیزیں ہیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، یہی وہ بنیادی تعلیمات تھیں جن کو پیغمبر عربی صلعم نے بھی اپنی تعلیم اور تزکیہ کا مرکز بنایا تھا، اس لیے ضرورت ہے کہ آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت ماننے والے بھی اپنی نگاہ کو اسی مرکز پر جمائے رہیں، اور اس کامل یقین کے ساتھ جمائے رہیں کہ دین حق کی اقامت کے لیے جس سر و سامان کار کی ضرورت ہے اس کی تیاری کے لیے قدرت نے صرف یہی چار "کارخانے" بنائے ہیں۔ دنیا کے دوسرے تمام کارخانوں کے ڈھلے ہوئے کل پرزے میجر اور سگنفرڈ لائنیں تو بنا سکتے ہیں مگر مسجد قبا کا ایک گوشہ بھی تعمیر نہیں کر سکتے۔ اب

جب کہ یہ چیزیں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ہماری کامیاب مساعی کا سارا انحصار ہی انہی پر ہے، ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم ان کے متعلق ایک ایک بات سے پوری واقفیت بہم پہنچالیں اور اچھی طرح یہ جان لیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے مطالبات و مقتضیات کیا ہیں؟ یہ اقامت دین کے نصب العین کے حصول میں کیوں ضروری ہیں اور کیونکر اور کس حد تک انسان کو اس کام کے لیے تیار کرتی ہیں اور آخر میں یہ کہ آنحضرت کی زندگی میں ان کی عملی تفصیلات کس نوع کی ہیں؟۔

(۱) ایمان باللہ یہ اس بنیاد کا سب سے پہلا پتھر ہے اور اسی لیے سب سے زیادہ اہم بھی ہے، اس قدر اہم کہ اس کے بغیر وجود اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو فی الواقع جس شے کو سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے، وہ یہی ایمان باللہ ہی ہو سکتا ہے اور نہ صرف دوسرے تمام اصول و احکام اسلامی بلکہ خود مذکورہ بالا وہ تینوں چیزیں بھی، جن کو ہم نے "سنگہائے بنیاد" میں شمار کیا ہے، اس کے مقابلے میں فروع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی موقع بیان اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی ساری صداقتوں کو بیان کرنے کے بجائے کم سے کم لفظوں میں ان کا مغز اور جوہر مخاطب کے سامنے رکھ دیا جائے تو کلام الٰہی اور کلام رسول دونوں ہی میں صرف ایمان باللہ کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور فروع تو فروع، دیگر اصولی ایمانیات کی طرف سے بھی سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن ایک جگہ کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (حٰم السجدہ - ۴)	یقیناً ان لوگوں پر جنھوں نے کہا کہ "ہمارا رب تو اللہ ہے" اور پھر اپنے اس قول پر پوری طرح جمے رہے، فرشتے یہ پیام لے کر اترتے ہیں کہ تمھیں کسی شے کا ڈر ہونا چاہیے نہ کسی چیز کا غم، اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

بعینہٖ یہی بات اور یہی انداز گفتگو پیغمبر صلعم کے ارشادات میں بھی موجود ہے، اور بکثرت موجود ہے، جیسے:

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ	جس نے کہا اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا

اور یہ اس لیے کہ "ایمان باللہ" کہنے میں تو صرف ایک بات ہے مگر اس پر سے لفظوں کا پردہ اٹھا دیجیے اور اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھیے تو اس کی تہ میں معانی و حقائق دینی کی پوری دنیا آباد نظر آئے گی۔

جس کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی تمام صفات کی صحیح معرفت حاصل ہوگی اس کو پھر نہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن آنے والا ہے۔ نہ وہ اس تذکیر کا محتاج ہے کہ اپنے رب اور معبودِ حقیقی کی یاد سانس کی طرح میری زندگی کا ایک لازمی وظیفہ ہے اور نہ وہ اس تلقین کا منتظر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے مجھے اس کے احکام کی اطاعت میں کسی کمزوری، کسی دل شکستگی اور مشکلات کے مقابلے میں کسی مرعوبیت کا شکار نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ اسی ایک آفتاب کی روشنی میں یمین و یسار کی ساری صداقتیں خود پالے گا۔ چنانچہ اس کی یہی بنیادی اور امتیازی اہمیت ہے جس کے باعث ہر نبی پر اس کی وحی کا آغاز اسی کی تعلیم سے ہوتا رہا ہے۔ طور کی پہاڑی پر اولین صدا جو آئی وہ یہی تھی کہ اِنِّیٓ اَنَا رَبُّكَ .....وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ۔ (موسیٰ! میں ہی تمھارا پروردگار ہوں!...... اور میں نے تمھیں پیام رسانی کے لیے منتخب کرلیا ہے، سو ان باتوں کو غور سے سنو جو تم پر وحی کی جارہی ہیں۔ بالیقین میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پس میری ہی بندگی کرو)۔ غارِ حرا میں سب سے پہلے جو الفاظ گونجے وہ بھی یہی تھے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا ہے۔

اور جب انبیاے کرام کو یہ حقیقت سب سے پہلے سمجھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو عام انسان کس شمار میں ہیں، وہ تو اور زیادہ اس کے محتاج تھے کہ ان کے کانوں میں سب سے پہلے یہی بات ڈالی جائے اور ان کے دلوں میں پہلے ہی دن اسی کی روح پھونکی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بلا استثنا ہر نبی نے اپنی امت کو دعوتِ حق دینے کا آغاز اسی بات سے کیا کہ:

اُعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ۔ اللہ کی بندگی کرو جس کے سوا تمھارا کوئی معبودِ حقیقی نہیں

پس ہر اس شخص کے لیے جو دینِ حق کی اطاعت و اقامت کا فرض ادا کرنے کی سچی نیت رکھتا اور اس کے لیے عملاً سعی و جہد کا آغاز کرنے جا رہا ہو، اولین شرط یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان باللہ کی روح کو پیدا یا بیدار کرے اور اپنے نفس کو ہرگز اس امر کی اجازت نہ دے کہ وہ اپنی پُرفریب تاویلوں اور سخن طرازیوں سے اس کے اندر رسوخِ ایمان کا جھوٹا پندار کرکے اس کو اس امر سے غافل کر دے۔ اس زمانہ میں جبکہ

گلی گلی ایسے مذہبی دربار قائم ہیں جہاں سے بالکل عمومی شرطوں پر ایمان صادق کی سندیں اور نجات اخروی کے "پرمٹ" بڑی دریادلی سے تقسیم کیے جارہے ہیں، ہمارے ذہنوں کا اس امر پر آمادہ ہونا سخت دشوار ہے کہ ہم صاحب ایمان ہونے کا اقرار و اعلان کرنے کے باوجود اپنے اندر ایمان باللہ کی روح کو پیدا اور بیدار کریں، کیونکہ ہم اس خوش گمانی میں مبتلا ہیں کہ ہمارے اندر تو (چشم بد دور) پہلے ہی سے، بلکہ ہمیشہ سے اسلام و ایمان موجود ہے، پھر ہم سے ایمان باللہ کا مطالبہ کیا معنی؟ مگر یہ ساری غلط اندیشیاں دراصل نتیجہ ہیں اس بات کا کہ ہم ایمان باللہ کی اس حقیقت سے بالکل اندھیرے میں ہیں جس کا قرآن ہم سے مطالبہ کرتا ہے اور ہم اس ایمان باللہ کو بھی، جس سے آج کے ہر کفر، ہر طاغوت، ہر ابوجہل، ہر قیصر اور ہر کسریٰ کی نہ صرف آشتی ہے بلکہ اس کو ان سب کی "حفاظت اور سرپرستی" حاصل ہے۔ اُسی ایمان باللہ کا ہم پلہ یا زیادہ سے زیادہ اسی کا ہم جنس سمجھتے ہیں جس کو دیکھ کر کبھی چشم باطل میں خون اتر آتا تھا۔ یہ خوش گمانی بلکہ خود فریبی ایک وبائے عام کی طرح ہر چہار سمت پھیلی ہوئی ہے اور ہر دماغ کے قوائے فکر و بصیرت کو ماؤف کیے ہوئے ہے۔ اس مہلک وبا سے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم ایمان کی ترازو، عقائد و کلام کی کتابوں کو بنانے کے بجائے کتاب و سنت کو بنائیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ایمان باللہ کا مطلب اور مقتضا کیا ہے، قرآن کے بیانات سے رہنمائی حاصل کریں، اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ عقائد و کلام کی کتابوں والا ایمان ایک اسلامی اسٹیٹ سے یا کسی مسلم سوسائٹی سے ہمیں اپنے سیاسی اور شہری و معاشرتی حقوق تو دلا سکتا ہے مگر اقامت دین کی راہ میں حائل ہونے والے مصائب کے طوفان سے ہماری کشتی کبھی پار نہیں لگا سکتا۔ یہ توفیق اور قدرت تو اللہ تعالیٰ نے اس ایمان کے لیے مخصوص کر رکھی ہے جو قرآن کی نگاہوں میں ایمان ہے۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس آئینہ میں جو قرآن و سنت نے ایمان باللہ کے لوازم و مقتضیات اور مومنین باللہ کی صفات و خصوصیات کی شکل میں ہمارے سامنے رکھا ہے، اپنے ایمان کے خط و خال دیکھیں اور اپنی سیرت و کردار کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ اگر کوئی نقص نظر آئے اور ہم اپنے کو وہ کچھ یا سب کچھ کرتے پائیں جو ایمان باللہ کی روح کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھاتا تو اس کو اس امر کی علامت سمجھیں کہ ایمان کی روح ہمارے اندر نہیں اتری ہے یا کم از کم یہ کہ اس روح پر غفلت اور پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس

احساس کے بعد ہمارا دوسرا فرض یہ ہو جانا چاہیے کہ اپنے دل و دماغ کی ساری قوتوں کے ساتھ اس روح کو اپنے اندر اتارنے اور اس کو ازسرنو بیدار و توانا کرنے کی فکر و سعی میں ڈوب جائیں۔ اس سعی کے عملی مناہج کیا ہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کا جواب ایک بندۂ مومن کا دل تو بڑی آسانی سے دے سکتا ہے مگر کسی زبان کے الفاظ اس کا تحمل شاید کیا یقیناً نہیں کر سکتے۔ تاہم قرآن اور سنت کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں ہمیں جو روشنی ملتی ہے اس کی رو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مقصود گرانمایہ کا حصول چند باتوں کا اہتمام اور التزام تو ضرور ہی چاہتا ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ پر محض رسمی، سمعی اور وراثتی طور پر ایمان رکھنے پر اکتفا کرنا چھوڑ دینا چاہیے یعنی صرف اس بنیاد پر خدا کی ذات و صفات پر ایمان لانا کافی نہ سمجھنا چاہیے کہ جن گروہوں میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں اور جس ماحول میں ہماری پرورش ہوئی ہے، وہاں اللہ کو ایک کہا جاتا اور اس کو علم و قدرت، حکمت و حاکمیت، عدل و رحمت اور خلق و امر وغیرہ صفات سے متصف گردانا جاتا تھا اس لیے ہم بھی یہی کہتے اور مانتے ہیں۔ یہ تقلیدی ایمان ہمارے لیے وہ قوت محرکہ نہیں بن سکتا جو ہمارے سینوں کو جوش عمل سے معمور کر دے اور جو راہ حق پرستی سے روکنے والے مادی علائق پر قینچی چلا دیا کرے۔ بلکہ ہمیں اپنی فکر و بصیرت سے کام لے کر اس ایمان کو پا لینے کی کوشش کرنی چاہیے جس میں اپنی ذاتی معرفت ہو، طمانیت ہو، سنی ہوئی نہیں بلکہ اپنی چشم دل کی دیکھی ہوئی حقیقت ہو۔ اس کے لیے قرآن کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے، اس طرح پڑھیے جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اللہ رب العالمین کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی صفات پر فطرت کے جن حقائق سے استشہاد کرتا ہے اور خود انسان کے اپنے نفس کی اور اس پورے کارخانۂ عالم کی جن مسلمہ حقیقتوں کو بطور دلیل پیش کرتا ہے، ان پر دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ غور کیجیے اور برابر کرتے رہیے، قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اس غور و فکر کے نتیجہ میں دل کے اندر وہ روشنی پیدا ہو کر رہے گی جو ذات و صفات الٰہی کے متعلق کسی جہل اور شک کی تاریکی باقی نہ رہنے دے گی۔ قرآن پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجیے کہ وہ آسمان و زمین کی عظیم الشان مخلوقات سے لے کر شہد کی مکھی تک جیسی معمولی اور حقیر چیزوں کا ذکر کر کے اور ان کے اندر اپنے ودیعت کیے ہوئے حیرت انگیز کرشموں کی طرف اشارہ کر کے

کس وثوق کے ساتھ فرماتا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اندر غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانی ہے)۔ اور جو لوگ اس کی بیان کی ہوئی ان محکم دلیلوں کے بعد بھی خدا کی وحدانیت کا اذعان اپنے اندر نہیں پیدا کر سکے، ان کے بارے میں وہ جھنجھلا کر کہتا ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے! یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں!)۔

(۲) علمی اور عقلی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت پیدا کر لینے کے بعد اطمینان کی نیند سو نہیں جانا چاہیے، اور جس طرح ہم علوم و فنون کے نکتے حل کر لینے کے بعد ان کو اپنی کتاب معلومات کی زینت بنا کر حفاظت سے رکھ چھوڑتے ہیں، وہ سلوک اس "نکتہ" کے ساتھ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ چاہیے یہ کہ یہ نکتہ فکر و ذکر کا مرکز بن جائے، ایک مجسم حقیقت کی شکل میں ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے، ہم کسی حال میں اور کسی جگہ ہوں اس کی یاد سے محروم نہ رہیں اور جہاں تک ہو سکے کوشش کرنی چاہیے کہ یہ نکتہ ہماری یادداشت کو اپنی کامل گرفت میں لے لے، ہم جدھر بھی نگاہ اٹھائیں، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، یہاں تک کہ خالی فضاؤں میں بھی ہمیں یہ حقیقت منقوش نظر آئے، یعنی جس طرح ایک پیاسا پیاس کی شدت میں اپنے گرد و پیش کی ہر موجود شے سے غافل ہو جاتا ہے مگر پانی کی یاد سے، جو فی الواقع اس کے سامنے موجود بھی نہیں ہوتا، غافل نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک مومن کی روح کو چاہیے کہ سب کچھ بھول جائے مگر خدا کو کبھی نہ بھولے۔ یہی راز ہے جس کی بنا پر ایمان باللہ کے سب سے بڑے رمز شناس نے فرمایا ہے کہ:

افضل الذکر لا الٰہ الا اللّٰہ — سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ کا ورد ہے

اور اسی بنا پر اس نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ:

جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللّٰہ — تم لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کر کے اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہو۔

[یاد رہے کہ اس "ذکر" کا مطلب ذکر کے وہ مصنوعی طریقے نہیں ہیں جو آجکل بالعموم مسلمانوں میں رائج ہیں، بلکہ یہ ذکر فکر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ پر ہم تفصیلی گفتگو ذکر و صلوٰۃ کے عنوان کے تحت کریں گے]

(۳) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا غور و تدبر کے ساتھ صحیح علم حاصل کر لینے اور اس "علم" کو ہر وقت

ذہن میں مستحضر رکھنے سے بھی ایمان باللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ابھی ایک منزل اور طے کرنی باقی ہے، اور یہی منزل اپنے رہروؤں کے لیے وہ بے نظیر خارزار پیش کرتی ہے جس کے کانٹوں سے آج تک کسی تلوے کو واسطہ نہیں پڑا، سوائے ان کے جو دینِ حق کی راہ میں اٹھے۔ کیونکہ اقامت دینِ حق کے سوا دنیا کسی ایسے نصب العین سے آج تک واقف نہیں جس کے علمبرداروں کو اس منزل سے گذرنا پڑا ہو۔ اس منزل کا نام ہے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضاجوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم اور ہمارے حافظہ پر تصور توحید کی گرفت اگر قائم بھی ہوگئی تو یہ ایمان باللہ کے تحقق کے لیے ہرگز کافی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے جذبات کو بھی اسی تصور کی گرفت میں دے دیں اور جس طرح وہ ہمارے حواسِ علم و حافظہ پر چھایا ہوا ہے اسی طرح اپنے جذبات پر بھی اسے چھاجانے دیں۔ ورنہ اس کے بغیر ہمارا ایمان ایک بے جان کا لاشہ ہوگا، بغیر بو کا پھول ہوگا، بے نور کا چراغ ہوگا۔ ایسا ایمان اس غایت مقصود تک ہمیں کبھی نہیں پہنچا سکتا جس کا نام قیامِ دین ہے۔ جذبات کو غلامی میں دیے بغیر معبودِ حقیقی کی کامل اطاعت نہیں ہو سکتی اور ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مومن کی علامت ہی یہ ٹھیرائی گئی ہے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت کرتا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ اور اللہ تعالیٰ علانیہ فرماتا ہے کہ مجھے نرے توحید کے عقلی نکتے بیان کرنے والوں اور صرف علم و نظریہ کی حد تک وحدانیت کے قائل فلسفیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ایسے بندے چاہئیں جو مجھ سے محبت رکھتے ہوں اور جو میری مرضی میں اپنی رضا کو گم کیے ہوئے ہوں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (مائدہ - ۸)

اے ایمان لانے والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو تمھاری جگہ اللہ اور کسی ایسی قوم کو لائے گا جو اس کی محبوب ہوگی اور جو اس سے محبت کرے گی۔

پس اس غلط فہمی میں کسی کو نہ پڑنا چاہیے کہ جس طرح ایک کمیونسٹ مارکس کے پیش کیے ہوئے نظامِ زندگی کو، اور ایک نیشنل سوشلسٹ ہٹلر کے بنائے ہوئے دستور کو اور ایک ہندوستانی وطن پرست گاندھی اور جواہر لال کے تیار کیے ہوئے فلسفۂ حیات کو عقلاً صحیح سمجھ کر ان کی پیروی کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کو ان "مقتداؤں" سے کوئی محبت اور شیفتگی بھی ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام پر بھی عمل کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی ہے

جس کی بنیاد سراسر سادہ لوحی اور حقیقت ناشناسی پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ زندگی رکھتا ہے اور از روئے عقل و تجربہ وہی ایک ایسا نظام زندگی ہے جو فطرت انسانی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور جو دنیا کے امن و فلاح کا ضامن بن سکتا ہے، مگر اس خام خیالی کے لیے عقلی یا نقلی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ محض بطور ایک سیاسی فارمولے کے اللہ تعالیٰ پر یا اس کے دیئے ہوئے مسلک حیات پر "ایمان" لا دینا یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ اس مسلک حیات پر عمل کرنا اب ممکن ہو گیا۔ یہ امکان تو صرف وہ محبت پیدا کر سکتی ہے جو ایک سچے مومن کو اس مسلک حیات کے اصل واضع اور اس کی نسبت میں اس کے بھیجے ہوئے نمائندے سے ہوتی ہے۔ اسلام جب ہماری زندگی کا کامل رہنما ہے تو اس میں سیاست کا ہونا بہرحال ضروری ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام کل کا کل "سیاست" ہی ہے۔ اس لیے جب تک ایمان باللہ علم و نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر ذوق و وجدان اور جذبات و میلانات تک میں سرایت نہ کر جائے اس راہ کے مسافر کو اپنی کمر نہیں کھولنی چاہیے، ورنہ وہ اپنی ساری تگ و دو ضائع کر دے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کیفیت قلب میں پیدا کس طرح ہو گی تو اس کا آخری انحصار تو بہرحال اللہ تعالیٰ کی توفیق پر ہے، مگر یاد رہے کہ یہ توفیق بھی وہ ایک مستقل اصول کے ماتحت دیتا ہے، اور وہ اصول ہے خود بندہ کی مخلصانہ طلب اور اس کے لیے عملی جدوجہد۔ یہ جدوجہد عبارت ہے کتاب الٰہی کی تلاوت، اس کی آیات پر تدبر، اللہ تعالیٰ کی صفات کمال و جمال میں تفکر، اس کی بے پایاں بخششوں اور نعمتوں اور رحمتوں کے تذکر اور اس کے احکام کی سرفگندانہ اطاعت سے۔

(۴) اس سلسلہ کی آخری چیز ذکر اور نماز ہے، مگر اس پر مفصل گفتگو اپنے موقع پر آئے گی۔

(باقی)